دینی مدارس کے کردار کا منصفانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ

مولانا زاہد الراشدی صاحب

دینی مدارس کے نصاب و نظام اور کردار کے حوالے سے دین دشمن طبقے اعتراضات اور مسلسل پروپیگنڈہ کر رہے ہیں، مولانا زاہد الراشدی صاحب نے سہ ماہی "وفاق المدارس" کے لیے ارسال کردہ اپنے اس مضمون میں ان اعتراضات کا ایک منصفانہ جائزہ لیا ہے جو نذر قارئین ہے۔ (ادارہ)

نحمده تبارك و تعالىٰ ونصلي ونسلم علىٰ رسوله الكريم وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين۔

اہل اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے انفرادی و اجتماعی اور شخصی و معاشرتی تمام معاملات میں وحی الٰہی کے پابند ہیں اور اُخروی نجات کے ساتھ ساتھ ان کی دنیوی کامیابی اور فلاح بھی آسمانی تعلیمات کی پیروی پر موقوف ہے۔ اہل اسلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور قرآن کریم وحی الٰہی کا فائنل اور مکمل ایڈیشن ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں جو معروضی حقائق سے مکمل مطابقت رکھتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کا صرف وہی حصہ تاریخ کے ریکارڈ میں مکمل طور پر محفوظ ہے جو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و تعلیمات پر مشتمل ہے، جبکہ اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر پر نازل ہونے والی وحی اور اس پیغمبر کی اپنی تعلیمات اس وقت دنیا میں کہیں بھی محفوظ حالت میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے آج جو شخص یا قوم بھی آسمانی تعلیمات کو اپنی زندگی کے معاملات میں راہ نما بنانا چاہے اس کے لیے قرآن کریم اور اُسوۂ محمد رسول ﷺ کی طرف رجوع کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اہل اسلام یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ چونکہ آسمانی تعلیمات ہی نسل انسانی کی صحیح راہنمائی کی ضامن ہیں اور انسان محض اپنی انفرادی یا اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر اپنے مسائل حل کرنے اور مثالی انسانی سوسائٹی تشکیل دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور چونکہ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی آسمانی تعلیمات کو مکمل اور محفوظ حالت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اس لیے اہل اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خود قرآن و سنت پر اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں مکمل طور پر عمل کریں بلکہ دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے بھی اسلامی تعلیمات کو پیش کریں اور انھیں دعوت دیں کہ وہ محض انسانی عقل و خواہش پر بھروسہ کرنے کی بجائے وحی الٰہی کی بالاتر راہنمائی کو قبول کریں اور آسمانی تعلیمات کے محفوظ ترین اور فائنل ایڈیشن قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے انسانی سوسائٹی کو عقل و

خواہش کی بے لگام پیروی سے نجات دلائیں، تاکہ دنیا کی انسانی آبادی مجموعی طور پر فطری قوانین اور نظام کے تحت امن وخوش حالی کی حقیقی منزل سے ہمکنار ہو سکے۔

اس پس منظر میں ہر مسلمان مرد اور عورت کا قرآن وسنت کی تعلیمات سے آراستہ ہونا اس کے دینی فرائض میں شامل ہے اور مسلمانوں کی مذہبی قیادت اسے اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے کہ وہ ہر مسلمان خاندان اور فرد کو ضروری دینی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو کچھ اُس کے بس میں ہو کر گزرے اور اس معاملہ میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھے۔

بیشتر مسلم ممالک پر برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور دیگر استعماری قوتوں کے تسلط سے قبل ان ممالک میں دینی تعلیمات کے فروغ کو ریاستی ذمہ داری شمار کیا جاتا تھا اور ہر مسلمان حکومت اپنے ملک کے باشندوں کو قرآن وسنت کی تعلیمات اور دینی احکام وفرائض سے آگاہ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی، جس کے لیے ہر ریاستی نظام میں خاطر خواہ بندوبست موجود ہوتا تھا، مگر جب استعماری قوتوں نے مختلف حیلوں اور ریشہ دوانیوں سے مسلم ممالک کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ان ملکوں کے نظاموں کو تبدیل کر کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی شعبہ میں بھی تبدیلی کر کے مسلم عوام کو دینی تعلیم کے صدیوں سے چلے آنے والے تسلسل سے محروم کر دیا، تو آسمانی تعلیمات کے تحفظ، دینی تعلیمات کے فروغ اور مسلم عوام کو قرآن وسنت کی تعلیمات واحکام سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری کو اپنا بنیادی اور ناگزیر فریضہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کی مذہبی قیادت نے اس کے لیے امداد باہمی کی بنیاد پر رضاکارانہ اور پرائیویٹ تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی، جو آج مختلف مسلم ممالک بالخصوص جنوبی ایشیا کے ممالک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں دینی مدارس کی شکل میں موجود ہے۔ برصغیر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں مغل حکومت کے دور میں ''درس نظامی'' کا یہی نصاب ملک کا سرکاری نصاب تعلیم تھا جو آج ضروری ترامیم اور تبدیلیوں کے ساتھ اسی نام سے دینی مدارس میں رائج ہے۔ اسے ''درس نظامی'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مُلّا نظام الدین سہالویؒ نے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاصرین میں سے تھے، کئی نسلوں سے پڑھائے جانے والے تعلیمی نصاب کو باقاعدہ اور مربوط نصاب کی شکل دی تھی، جس کے بعد یہ نصاب انہی کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس نصاب میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل علوم شامل ہیں:

(۱) قرآن پاک اور حدیث رسول ﷺ ترجمہ وتشریح کے ساتھ۔

(۲) صرف ونحو اور عربی ادب وگرامر کے دیگر فنون تاکہ قرآن وسنت تک براہ راست رسائی آسان ہو۔

(۳) فقہ اسلامی، تاکہ قرآن وسنت سے مستنبط احکام وقوانین سے آگاہی ہو۔

(۴) یونانی منطق وفلسفہ، تاکہ اس منطق وفلسفہ کے عروج اور عمل داری کے دور میں لکھے گئے اسلامی لٹریچر کے وسیع ذخیرہ تک رسائی ممکن ہو۔

(۵) علم کلام، تاکہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلامی عقائد کا فرق اور عقائد کے حوالہ سے مسلمان فرقوں کی تعبیرات کا باہمی فرق ذہنوں میں واضح ہو۔

(۶) ریاضی اور حساب، تاکہ باہمی لین دین اور حساب کتاب کو نمٹانا آسان ہو۔

(۷) فارسی زبان، جو مغل دور کی سرکاری زبان تھی اور درس نظامی کے نصاب کا لازمی حصہ تھی، تاکہ دفتری اور سرکاری اُمور میں بلا جھجک شرکت ہو سکے۔

(۸) کتابت وتحریر، تاکہ لکھنا پڑھنا آسان ہو۔

اس طرح ایک مہذب اور منظم سوسائٹی میں تعلیم کے تمام ضروری تقاضے مثلاً خواندگی، دفتری زبان، مروّجہ قوانین، مذہبی

زبان، عقائد و نظریات، کلچر و ثقافت، اسلامی لٹریچر تک رسائی، حساب و کتاب اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے آگاہی تک کے سب اہم اور ناگزیر اُمور اس نصاب کے اندر سمو دیئے گئے تھے۔ ملک کی عام آبادی کے لوگ مسلم اور غیر مسلم یہی نصاب پڑھتے تھے۔ اور اسی نصاب کی بنیاد پر انتظامی، عدالتی اور مالیاتی شعبوں میں تمام مناصب تک پہنچتے تھے۔ مگر جب برطانوی استعمار نے مغل حکومت سے اقتدار چھین کر اس خطہ میں اپنی حکومت قائم کرلی اور انتظامی، مالیاتی اور عدالتی نظام کو یکسر بدل دینے کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی فارسی کی بجائے انگریزی مقرر کردی تو اجتماعی اور ریاستی معاملات سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے "درس نظامی" کی بنیاد پر چلنے والا یہ پورا نصاب و نظام بے مصرف ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ نئے حکمرانوں کے نافذ کردہ جدید تعلیمی نظام نے لے لی۔

"درس نظامی" کا یہ تعلیمی نظام صرف عدالتی، انتظامی، مالیاتی اور دیگر ریاستی شعبوں کو ہی رجال کار فراہم نہیں کرتا تھا بلکہ ملک بھر میں مساجد کے لیے ائمہ، دینی راہ نمائی کے لیے علماء اور قرآن و سنت کی بنیادی تعلیم کے لیے معلم اور استاذ فراہم کرنا بھی اسی تعلیمی نظام کی ذمہ داری تھی۔ اس لیے شدید خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر اس تعلیمی نظام کو کسی نہ کسی درجہ میں باقی نہ رکھا گیا یا اس کا کوئی متبادل فراہم نہ کیا گیا تو ملک بھر کی لاکھوں مسجدوں میں امام فراہم نہ ہونے کی وجہ سے عبادات کا سلسلہ معطل ہو جائے گا، معاشرہ میں عام لوگوں کی راہ نمائی کے لیے علماء کرام اور مفتیان کرام موجود نہ ہونے کی وجہ سے دین کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ منقطع ہو جائے گا اور قرآن و حدیث کی بنیادی تعلیم کے لیے معلم و استاذ میسر نہ ہونے کے باعث عام مسلمان اپنے بنیادی دینی فرائض اور احکام سے بے خبر ہو کر رہ جائے گا۔

اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے کچھ مردان خیر نے مسجد و مدرسہ کے معاشرتی کردار کو بحال رکھنے کی حد تک درس نظامی کے اس سسٹم کو بہر حال قائم رکھنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے رضاکارانہ عوامی چندہ اور امداد باہمی کے اصول کو بنیاد بنا کر پرائیویٹ دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابتداء میں دیوبند، سہارنپور، مراد آباد اور دیگر چند شہروں میں دینی مدارس قائم ہوئے، لیکن یہ ضرورت چونکہ پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشترکہ ضرورت تھی اس لیے ایک قابل عمل مثال سامنے آتے ہی ملک کے طول و عرض میں اس قسم کے دینی مدارس کا جال بچھ گیا۔ ان مدارس کا نصاب بنیادی طور پر وہی چلا آرہا ہے جس کا تذکرہ سطور بالا میں "درس نظامی" کے حوالہ سے کیا گیا ہے، مگر اسے بے لچک اور جامد نصاب کے طور پر نہیں اختیار کیا گیا بلکہ ہر دور میں اجتماعی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں مناسب تبدیلیاں بھی کی گئیں اور ان تبدیلیوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ تاہم تعلیمی نصاب اور نظام کے حوالہ سے ان مدارس کے ارباب حل و عقد نے بعض ناگزیر تحفظات کے پیش نظر دو باتوں کو بنیادی پالیسی کے طور پر اختیار کیا اور یہی دو باتیں عالم اسباب میں ان مدارس کے نظام میں استحکام اور ان کے جداگانہ تشخص و امتیاز کی بقا کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

o مالیاتی اُمور میں مدارس کے اس نظام نے ریاستی اداروں سے مکمل بے نیازی کا رویہ اختیار کیا۔ سرکاری امداد کسی صورت میں قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور نہ ہی کسی سطح پر سرکاری مداخلت کو در آنے کا موقع فراہم کیا۔ ان مدارس نے اپنے اخراجات اور مالیاتی ضروریا کو پورا کرنے کے لیے عوام کے صدقات، زکوٰۃ، عطیات اور چندے کی دیگر صورتوں پر بھروسہ کیا اور انتہائی قناعت اور بے نیازی کے سا بہت تھوڑے خرچہ سے کام چلایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی حکومت ان مدارس کے معاملات میں مداخلت کے لیے راہ نہ پا سکی او مدارس پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔

o ان مدارس نے شعوری طور پر یہ پالیسی اختیار کی کہ ان کے فارغ التحصیل علماء کی غالب اکثریت مسجد و مدرسہ کے سوا کسی او شعبہ زندگی میں نہ کھپ سکے اور اسی وجہ سے یہ مدارس جدید تعلیم کو اپنے نصاب میں پوری طرح شامل کرنے سے اب تک گریزاں ہیں: کیونکہ انہیں بجا طور پر یہ خطرہ ہے کہ اگر ان کے تربیت یافتہ افراد بھی مسجد و مدرسہ کے نظام کا حصہ بننے کے بجائے دوسرے شعبوں میں چلے

جائیں گے تو مسجد ومدرسہ کے لیے امام اور استاد فراہم کرنے کا کام پھر سے ادھورا رہ جائے گا اور وہ خلاء بدستور موجود رہے گا جس کو پُر کرنے کے لیے دینی مدارس کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور اس طرح پرائیویٹ دینی مدارس کے اس نظام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان اور دیگر جدید علوم وفنون کو داخل نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان مدارس کے ارباب حل وعقد انگریزی زبان کو ناجائز سمجھتے تھے، جیسا کہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے، کیونکہ انگریزی زبان کو بطور زبان سیکھنے کے جواز کا فتویٰ تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اس دور میں دے دیا تھا جبکہ ابھی دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور یہ فتویٰ آج بھی فتاویٰ عزیزی میں موجود ہے۔ اسی طرح یہ علماء جدید سائنسی علوم کے بھی مخالف نہیں تھے اور عام مسلمانوں کو ان کے حصول کی ترغیب دیتے رہتے تھے، البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ دینی مدارس سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے والے علماء مسجد ومدرسہ کے ماحول تک محدود رہیں اور یہاں سے نکل کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہ کھپ جائیں تاکہ وہ خلاء دوبارہ عود نہ کر آئے جو برطانوی حکومت کی طرف سے درس نظامی کے مدارس کو ختم کرنے سے پیدا ہو گیا تھا اور جسے پُر کرنے کے لیے یہ دینی مدارس پرائیویٹ سطح پر کامیاب کوشش کر رہے تھے۔

مگر ان بنیادی تحفظات کے باوجود دینی مدارس نے اپنے نصاب میں ضروری تبدیلیوں اور ترامیم سے کبھی گریز نہیں کیا اور ہر دور میں نصاب میں ردوبدل کا یہ سلسلہ جاری رہا، مثلاً:

o مغل دور میں درس نظامی کے نصاب میں حدیث نبوی ﷺ کی صرف ایک کتاب "مشکوٰۃ شریف" شامل تھی، جبکہ اس کے بعد صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے ساتھ مؤطا امام مالک اور دیگر کتب احادیث بھی شامل نصاب کی گئی ہیں۔

o مختلف فنون میں پرانی کتابوں کی جگہ نئی کتابیں شامل کی گئی ہیں اور بعض کتابیں بطورِ خاص اس مقصد کے لیے لکھوائی گئی ہیں۔

o سینکڑوں دینی مدارس کے ساتھ مڈل اور ہائی اسکول کی سطح پر عصری تعلیم کے اسکول قائم ہیں اور انگریزی اور ریاضی جیسے ضروری مضامین بنیادی ضرورت کی حد تک خود درس نظامی کے نصاب میں بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

o امتحانات کے نظام کو باہمی مربوط بنانے کے لیے مختلف بورڈ ملکی سطح پر قائم ہیں، جو جدت اسلوب اور معیار کے مطابق امتحانات کا نظام مرتب کرتے ہیں، ان کی نگرانی کرتے ہیں، امتحانات کے لیے پرچے تیار کیے جاتے ہیں، ان کی مارکنگ ہوتی ہے، رزلٹ جاری کیے جاتے ہیں اور ملک گیر سطح پر امتحانات کے سسٹم میں یکسانیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

o بہت سے بڑے مدارس نے مختلف مضامین میں تخصص (پی ایچ ڈی) کے شعبے قائم کر رکھے ہیں جن میں افتاء، دعوت وارشاد اور تقابل ادیان کے مضامین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

o ان مدارس کی اسناد کو مختلف سطحوں پر یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن آف پاکستان نے تسلیم کیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:۔

☆ ان مدارس کے فضلاء بیرون ملک معروف تعلیمی اداروں بالخصوص جامعہ ازہر قاہرہ، مدینہ یونی ورسٹی اور دیگر بین الاقوامی یونی ورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور امتیازی پوزیشن سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اس تناظر میں ان دینی مدارس کی معاشرتی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کا سرسری خاکہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ یہ دینی مدارس:

(۱) ملک کے لاکھوں نادار افراد کو نہ صرف تعلیم سے بہرہ ور کرتے ہیں بلکہ ان کی ضروریات مثلاً خوراک، رہائش، علاج اور کتابوں وغیرہ کی کفالت بھی کرتے ہیں۔

(۲) معاشرہ میں بنیادی تعلیم اور خواندگی کے تناسب میں معقول اضافہ کا باعث ہیں۔

(۳) قرآن وسنت کی تعلیم اور دینی علوم کی اشاعت وفروغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

(۴) عام مسلمانوں کو عبادات، دینی راہنمائی اور مذہبی تعلیم کے لیے رجال کار فراہم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

(۵) عام مسلمانوں کے عقائد، عبادات، اخلاق اور مذہبی کردار کا تحفظ کرتے ہیں اور دین کے ساتھ ان کا عملی رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

(۶) اسلام کے خاندانی نظام اور کلچر وثقافت کی حفاظت کر رہے ہیں اور غیر اسلامی ثقافت وکلچر کی یلغار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے مضبوط حصار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۷) اسلامی عقائد واحکام کی اشاعت کرتے ہیں اور ان کے خلاف غیر مسلم حلقوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات و شبہات کا جواب دیتے ہیں۔

(۸) اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عقائد واحکام سے انحراف اور بغاوت کا مقابلہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کی "راسخ العقیدگی" کا تحفظ کرتے ہیں۔

(۹) مادہ پرستی، مفادات، خود غرضی اور نفسا نفسی کے اس دور میں قناعت، ایثار، سادگی کی روحانی اقدار کو مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے میں باقی رکھے ہوئے ہیں۔

(۱۰) وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے مکمل اور محفوظ ذخیرہ کی نہ صرف حفاظت کر رہے ہیں بلکہ سوسائٹی میں اس کی عملی تصدیق کا نمونہ بھی باقی رکھے ہوئے ہیں، تاکہ نسل انسانی کے وہ سلیم الفطرت لوگ جو "عقل وخواہش" کی مطلق العنانی کے تلخ اور تباہ کن معاشرتی نتائج کو محسوس کرتے ہیں، فطرت کی واپسی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور جن کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، انہیں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے حقیقی سرچشمہ تک رسائی میں کوئی دقت نہ ہو اور اس طرح یہ مدارس صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

اس موقعہ پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ سسٹم کے بارے میں عام طور پر کیے جانے والے دو تین سوالات کا جائزہ بھی لے لیا جائے تاکہ ان مدارس کے ناقدین کا موقف اور اس کی حقیقت بھی سامنے آجائے۔ مثلاً:

○ یہ مدارس "بنیاد پرستی" کو فروغ دے رہے ہیں جو "گلوبلائزیشن" کے اس دور میں "ملٹی نیشنل کلچر" اور مشترکہ عالمی سوسائٹی کی تشکیل میں رکاوٹ ہے۔

○ ان مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات مختلف جہادی تحریکات میں عسکری خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اس طرح یہ مدارس "دہشت گردی" کے فروغ کا باعث ہیں۔ نیز ان مدارس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عسکری ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔

○ قومی سطح پر یہ مدارس اجتماعی دھارے میں شامل ہونے کی بجائے الگ تشخص قائم رکھنے پر مصر ہیں اور مروّجہ ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ قبول نہیں کر رہے، جس کی وجہ سے قوم میں "دوذہنی" کی فضا موجود ہے اور یہ دوہرا نظام قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

☆ جہاں تک "بنیاد پرستی" کا تعلق ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ مدارس عام مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں اس "سولائزیشن" کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، جو مذہب کے اجتماعی کردار کی

نفی کرتے ہوئے سوسائٹی کی "اجتماعی عقل وخواہش" کی بنیاد پر سیکولر ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے، تو "دینی مدارس" کو اس الزام کے قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں بلکہ وہ اسے اپنے لیے الزام کے بجائے اعزاز اور کریڈٹ سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے اس کردار کی اثر خیزی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جارہا ہے۔

دینی مدارس کا بنیادی موقف ہی یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہ نمائی اور قیادت کے لیے انفرادی یا اجتماعی "عقل وخواہش" کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی نگرانی اور بالادستی ضروری ہے اور اس سے ہٹ کر اباحیت مطلقہ اور ہمہ نوع آزادی کی بنیاد پر جو کلچر "گلوبل سولائزیشن" کے نام پر فروغ دیا جارہا ہے وہ سراسر غلط ہے، گمراہی ہے اور نسل انسانی کو مزید تباہی اور انارکی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اگر دینی مدارس اس موقف میں لچک پیدا کرلیں تو خود ان کا مقصد وجود ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور ان کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اس لیے اس معاملہ میں دینی مدارس کسی قسم کی کوئی لچک قبول کرنے کے روادار نہیں ہیں۔

دوسرا سوال جہادی اور عسکری تحریکات میں دینی مدارس کے طلباء کی کثرت کے ساتھ شمولیت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ دو مسئلے قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔ ایک مسئلہ جہاد کے بارے میں شرعی احکام اور قرآن وسنت کے فرمودات کی تعلیم کا ہے، وہ یقیناً ان مدارس میں ہوتی ہے اور اسی طرح ہوتی ہے جس طرح قرآن وسنت کے احکام وقوانین کے باقی شعبوں کی ہوتی ہے۔ یہ دینی تعلیمات کا حصہ ہے اور کسی دینی ادارے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن وسنت کی دیگر تعلیمات کا تو اپنے ہاں اہتمام کرے مگر جہاد سے متعلقہ آیات قرآنی، احادیث نبوی ﷺ اور فقہی ابواب کو صرف اس لیے نصاب سے خارج کردے کہ دنیا کے کچھ حلقے اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ جہاد کی عملی تربیت اور عسکری ٹریننگ کا ہے۔ یہ ان مدارس میں کسی سطح پر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان مدارس میں ایسا کوئی نظام موجود ہے جو طلبہ کو اس طرح کی ٹریننگ دیتا ہو، حتیٰ کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں این۔ سی۔ سی طرز کی جو نیم فوجی تربیت عام طلبہ کو دی جاتی ہے دینی مدارس کے نظام میں وہ بھی باضابطہ طور پر موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا قطعی طور پر غلط ہے کہ دینی مدارس اپنے طلبہ کو عسکری ٹریننگ دیتے ہیں، البتہ دینی مدارس کے طلبہ یہاں سے فارغ ہو کر یا چھٹیوں کے دوران اپنی آزادانہ مرضی سے کسی دباؤ کے بغیر جہادی تحریکات کے مراکز میں جاتے ہیں، ٹریننگ حاصل کرتے ہیں اور کسی نہ کسی محاذ پر جہاد میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مدارس نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ٹریننگ کے یہ مراکز مدارس کے سسٹم میں شامل ہیں۔ ان کا نظم اور ذمہ داری بالکل مختلف دائرہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار ٹھہرانا قطعی طور پر غلط بات ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے سرکاری کالجوں، اسکولوں اور یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہزاروں نوجوان مختلف عسکری تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں، جن میں جہادی تحریکات بھی ہیں، لسانی گروپ بھی ہیں، علاقائی تنظیمیں بھی ہیں اور طبقاتی گروہ بھی ہیں۔ حتیٰ کہ ڈکیتی اور رہزنی کے گینگ بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ نوجوان بھی تلف ٹریننگ سنٹروں میں عسکری تربیت حاصل کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کارروائیاں کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی گروہ کی کارروائیوں مہ داران کے تعلیمی اداروں کو قرار نہیں دیا جاتا اور انہیں ان کے ذاتی فعل اور پسند پر محمول کیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی دینی مدارس کے بہ بھی اگر تعلیمی نظام اور ڈسپلن سے ہٹ کر جہادی تحریکات میں شامل ہوتے ہیں اور عسکری تربیت حاصل کر کے کسی کارروائی میں حصہ تے ہیں تو اس کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

تیسرا سوال قومی اجتماعی دھارے سے الگ رہنے اور جداگانہ تشخص قائم رکھنے کا ہے۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ اس کا تعلق بھی ان مدارس کے مقصد وجود سے ہے، کیونکہ جب تک ریاستی نظام، معاشرہ میں دینی تعلیمات کے فروغ، مساجد کے لیے ائمہ کی فراہمی، دینی راہ نمائی کے لیے علماء کی تیاری اور قرآن وسنت کی تعلیم کے لیے اساتذہ مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس کے لیے قابل

قبول عملی نظام پیش نہیں کرتا اس وقت تک ان مدارس کے قیام و وجود کی ضرورت بہر حال باقی رہے گی، ورنہ وہی خلاء پیدا ہو جائے گا جس کو پُر کرنے کے لیے یہ مدارس قائم کیے گئے تھے۔ اور اس ''خلاء'' کو باقی رکھنے کا کوئی باشعور مسلمان رسک نہیں لے سکتا۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے نہ صرف ان مدارس کا وجود ضروری ہے بلکہ ان کی اس مالیاتی خود مختاری، انتظامی آزادی اور نصابی تحفظات کا برقرار رکھنا بھی ناگزیر ہے جس کے بغیر یہ اپنا کردار اعتماد کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے۔ اس لیے دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی نظام اور معاشرہ میں ''دوذہنی'' اور ''تعلیمی دوئی'' کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری ریاستی نظام پر عائد ہوتی ہے جو اس کردار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جو ان دینی مدارس کے جداگانہ وجود کا باعث ہے مگر ان مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کی خواہش کا بار بار اظہار کر رہا ہے جس کا منطقی نتیجہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے اس نظام کو یکسر ختم اور بے اثر کر دینے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

اس سلسلہ میں دو عملی اور واقعاتی مثالوں کو سامنے لانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے مسئلہ کی نوعیت اور اس حوالہ سے دینی مدارس کے تحفظات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

بہاول پور میں ریاستی دور میں ''جامعہ عباسیہ'' کے نام سے دینی علوم کی ایک بڑی درس گاہ قائم تھی، جسے ریاست بہاول پور کے پاکستان میں باقاعدہ انضمام کے بعد یہ کہہ کر ''جامعہ اسلامیہ'' کا نام دیا گیا کہ اسے عصری اور دینی تعلیم کے امتزاج کے ساتھ ایک تجرباتی یونی ورسٹی بنایا جائے گا۔ اس میں مروّجہ سرکاری نصاب اور درس نظامی کو ملا کر ایک مخلوط نصاب رائج کیا گیا۔ ملک بھر سے جید علماء کرام اور ماہرین تعلیم کو یہاں لایا گیا مگر اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ ادارہ کہلاتا تو ''اسلامی یونی ورسٹی'' ہے مگر اس کے نصاب و نظام میں دینی تعلیم اور درس نظامی اس طرح تحلیل ہو کر رہ گیا ہے کہ دوسری سرکاری یونی ورسٹیوں اور اس میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

اسی طرح اوکاڑہ شہر میں گول چوک کی بڑی مسجد کے ساتھ ایک معیاری دینی تعلیمی ادارہ ''جامعہ عثمانیہ'' کے نام سے قائم تھا، جسے محکمۂ اوقاف نے یہ کہہ کر تحویل میں لیا کہ اس کا نظام سرکاری طور پر چلایا جائے گا، مگر اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ ''جامعہ عثمانیہ'' کا آج کوئی وجود نہیں ہے اور اس کے بیسیوں کمرے مختلف فرموں اور اداروں کو کرائے پر دے دیئے گئے ہیں جن کا کرایہ محکمۂ اوقاف وصول کر رہا ہے۔

ان دو عملی مثالوں کے بعد بھی اگر دینی مدارس کو ریاستی نظام کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ قبول کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے اور سرکاری سرپرستی میں آنے کی ترغیب دی جا رہی ہے تو اس مشورہ کو دینی مدارس کے ساتھ ''نادان دوستی'' کے سوا اور کس عنوان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

دینی مدارس کے اس نظام و نصاب میں مزید اصلاحات کی ضرورت سے انکار نہیں ہے، بلکہ خود ہم بہت سی اہم اصلاحات کے داعی ہیں اور مختلف مضامین میں اس کا تفصیل کے ساتھ اظہار کر چکے ہیں، لیکن اس کے لیے دینی مدارس کا مقصد قیام، ان کی خود مختاری اور ان کے جداگانہ تعلیمی تشخص کا تحفظ سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان تین معاملات میں لچک نہ صرف دینی مدارس کے تاریخی معاشرتی کردار کی نفی ہوگی بلکہ ''گلوبل سولائزیشن'' کے نام سے مغرب کی مادر پدر آزاد سیکولر ثقافت کی یلغار کے سامنے سپر انداز ہو جانے کے مترادف ہوگی جس کی توقع مغرب کو کسی باشعور مسلمان سے نہیں رکھنی چاہیے۔

مدارس دینیہ کے خلاف اس مسموم فضا میں وہ حق پسند و حقیقت پسند حضرات قابل تحسین ہیں جو ان کی ضرورت و افادیت اور خدمات کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ ان مدارس کے ساتھ مالی و اخلاقی تعاون کرتے ہوئے اسلام کی آواز کو سربلند کرنے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین